- دو دوستوں کے درمیان ابتدائی طبی امداد کے بارے میں مکالمہ تحریر کریں۔
- ''تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق ہے'' کے موضوع پر دو دوستوں کے درمیان مکالمہ تحریر کریں۔
- دو ہم جماعتوں کے درمیان کھیلوں کے فائدے اور نقصانات پر ایک مکالمہ تحریر کریں
- دو دوستوں کے درمیان لوڈ شیڈنگ کے موضوع پر مکالمہ لکھیں۔
- گاہک اور درزی کے درمیان ایک مفروضہ مکالمہ لکھیں۔

❁❁

آپ بیتی یا خودنوشت

آپ بیتی اور خودنوشت ہم معنی الفاظ ہیں۔آپ بیتی سے مراد ہے ان حالات، واقعات اور کیفیات کا بیان سے جن سے کوئی شخص خود گزرا ہو۔خود کے معنی بھی اپنے آپ کے ہیں جب کہ نوشت فارسی کے مصدر نوشتن سے نکلا ہے جس کے معنی لکھنا، تحریر کرنا وغیرہ کے ہیں۔گویا اپنی ذاتی زندگی کے احوال و واقعات کا ایسا بیان آپ بیتی یا خودنوشت کہلاتا ہے جس میں مصنّف کی داخلی کیفیات اور احساسات بھی شامل ہوتے ہیں۔ایک اچھی آپ بیتی زندگی کے بارے میں مصنّف کے نقطۂ نظر کی ترجمان ہوتی ہے جو مندرجہ ذیل دو خصوصیات کی حامل ہوتی ہے:

(الف) زندگی کا غیر جانب دارانہ جائزہ (ب) متاثر کُن اسلوبِ نگارش

اردو زبان میں آپ بیتی کا آغاز مولانا جعفر تھانیسری کی خودنوشت ''کالا پانی'' سے ہوا۔اردو زبان و ادب کے حوالے سے مولانا حسرت موہانی کی ''قیدِ فرنگ'' ایک بہترین خودنوشت ہے۔، دیوان سنگھ مفتون کی ''ناقابلِ فراموش''، جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات''، احسان دانش کی ''جہانِ دانش'' اور قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' جیسی تحریریں بھی اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔

ہمارے نصاب میں عام طور پر شخصیات کی آپ بیتی موضوعِ بحث نہیں ہوتی بلکہ غیر حقیقی اشیا، جمادات اور نباتات آپ بیتی کا موضوعِ سخن ہوتے ہیں۔ان چھوٹے چھوٹے موضوعات پر آپ بیتی لکھنا دراصل ادیبانہ اسلوب کا تقاضا کرتا ہے۔جس طرح انشائیہ کا موضوع کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز مچھر، کیڑا، اور عینک وغیرہ ہو سکتے ہیں جن کے متعلق لکھتے ہوئے انشائیہ نگار ایسا نیم مزاحیہ اندازِ تحریر اختیار کرتا ہے کہ قاری زیرِ لب مسکراتے ہوئے ایک نشست میں اسے پڑھ لیتا ہے، ایسا ہی اندازِ تحریر آپ بیتی کے لیے بھی اختیار کرنا چاہیے۔کرسی، میز، مکان، پھول اور درخت جیسے موضوعات چنیے اور ان مجرّد اور بے زبان اشیا کو مشخّص کرتے ہوئے انھیں گویائی دیجیے اور قلم کی جولانیاں دکھائیے اور ایک اچھے شاعر اور ادیب کی طرح اپنے مشاہدے، تجربے اور قوّتِ متخیّلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے حقیقت اور مبالغہ آرائی کے خوب صورت امتزاج سے بامقصد تحریر صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیجیے۔

❁

چند اہم ہدایات

- ادبی شان کی حامل آپ بیتی تخلیق کریں۔
- موضوع کے مطابق صیغہ واحد متکلّم یا جمع متکلّم اختیار کریں۔ مقبولِ عام کردار کو 'میں' یا 'ہم' کے طرزِ تخاطب سے شروع کریں۔
- زیبِ داستاں کے لیے رنگ آمیزی، جدّت اور دلچسپی پیدا کریں۔
- واقعات کی ترتیب و تنظیم زمانی اور مکانی حقائق کے مطابق منطقی اور فطری ہونی چاہیے۔
- معاشرتی مسائل کی نشان دہی کی جائے۔
- معاشرے کی بے راہ روی اور خرابی کی اصلاح کے لیے طنز و مزاح کا انداز اپنایا جاسکتا ہے۔
- موقع محل کے مطابق محاورے اور ضرب الامثال استعمال کریں لیکن ان کی بھرمار نہ ہو۔
- اچھے موضوع اور موقع کی مناسبت سے معیاری اشعار سے مدد لی جاسکتی ہے۔
- زبان میں سلاست، تازگی اور شگفتگی قائم رہے۔
- غیر اخلاقی اور متعصّبانہ باتوں سے بہر صورت گریز کریں۔

❁

۱ ایک پھول کی آپ بیتی

ایک خزاں زدہ پھول اپنی آپ بیتی کا آغاز ان اشعار سے کرتا ہے:

ہوتے ہیں پائمال تو کہتے ہیں زرد پھول　　کل رحمتِ عمیم کا ہم پر بھی تھا نزول
یارانِ بوستاں میں ہمارا بھی تھا شمول　　اے راہ رو نہ ڈال ہمارے سروں پہ دھول
ہر چند انجمن کے نکالے ہوئے ہیں ہم
لیکن صبا کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم

جناب میرا یہ بکھرا ہوا وجود، یہ حالتِ زار، یہ اُڑی اُڑی سی رنگت، یہ پژمردگی اور یہ بے قدری جو اس وقت آپ کے پیشِ نظر ہے، کبھی میرے تصوّر میں بھی نہیں تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ عروج یوں بھی زوال پذیر ہوتا ہے، بلندیاں یوں بھی پستیوں کا شکار ہوتی ہیں اور لطف و عنایات یوں بھی نظر اندازی کی زد میں آسکتی ہیں۔ استغفار، استغفراللہ، استغفراللہ۔ آج سے صرف ایک سال پہلے کی بات ہے کہ باغِ جناح میں شجر کاری مہم کی ایک خوب صورت تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت کمشنر صاحب نے کی۔ تقریب کے اختتام پر باغ کے عین وسط میں رنگ برنگے پھولوں کے درمیان کمشنر صاحب کے دستِ مبارک سے گلاب کا ایک پودا لگایا گیا۔ باغ کے ملازمین نے اس پودے پر بالخصوص بہت توجہ دی۔ وہ ہر ہفتے اس کے اردگرد گوڈی کرتے، کھاد ڈالتے اور وقتِ

ضرورت اس کی آبیاری کرتے۔

موسمِ بہار آتے ہی اس پودے پر سرسبز کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ چند ہی دنوں میں وہ سبز پتّوں سے بھر گیا اور ساتھ ہی اس کی شاخوں پر بے شمار غنچے نمودار ہونے لگے۔ گلاب کے اس پودے کے عین سرے پر نسبتاً ایک بڑا غنچہ نمودار ہوا جو میری پیدائش کی خوش خبری کا اعلان تھا۔ مجھے باغ میں ارد گرد رنگ آمیزی کرتے، خوشبوئیں بکھیرتے، چراغِ لالہ بنتے اور لہلہاتے پھول نظر آتے تو میں ان کی دل کشی پر رشک کرتا اور دل ہی دل میں ان جیسا وجود پانے کی دعائیں مانگتا۔ ایک دن سورج کی روشن کرنیں میرے لیے نویدِ صبحِ بہار لائیں اور میں بھی کھلتے ہوئے ایک پھول کی صورت اختیار کر گیا:

اُف یہ دستورِ چمن ، آہ یہ آئینِ حیات
پھول کہلاتا ہے غنچے کا پریشاں ہونا

میرا پرکشش اور دل کش وجود، میری تازگی اور شگفتگی، میری چٹک اور چمک دمک اور باغ میں میرا مقام و مرتبہ، میں اپنے آپ کو دیکھ دیکھ کے پھولے نہ سماتا تھا۔ میری رنگ آمیزی، نزاکت اور خوب صورتی نے مجھے وہ فخر و ناز عطا کیا کہ شاید و باید۔ باغ میں جو بھی داخل ہوتا فوراً میری طرف کھنچا چلا آتا۔ طلبہ، لڑکے، لڑکیاں، چھوٹے، بڑے سب میرے ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں بنواتے۔ رات کی تنہائی، گہرے سنّاٹے اور اندھیرے میں بھی میری سرخ رنگت چراغ کی طرح روشن نظر آتی۔ آنے والا ہر لمحہ میری قدر و قیمت میں اضافے کا سبب بنتا۔ مگر دل ہی دل میں مجھے دو طرح کے خدشات لاحق تھے۔ ایک یہ کہ کہیں مجھے کسی کی نظر نہ لگ جائے اور دوسرا یہ کہ کہیں کوئی مجھے کوئی توڑ کر پودے سے الگ نہ کر دے۔ باغ میں جگہ جگہ ''پھول توڑنا منع ہے'' کے بورڈ آویزاں تھے جنھیں پڑھ کر مجھے تسلّی ہو جاتی تھی لیکن:

پھول کھلے ہیں لکھا ہوا ہے توڑو مت
اور مچل کر جی کہتا ہے چھوڑو مت

وہی ہوا جس کا مجھے خوف اور ڈر تھا۔ ایک لڑکی نے للچائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا، ادھر اُدھر پھرتے ملازمین سے آنکھ چرائی، اس کا ظالم ہاتھ میری طرف بڑھا اور اس نے نہایت بے دردی سے مجھے پودے سے جدا کر دیا اور جھٹ سے مجھے اپنے جُوڑے میں سجا لیا:

نہیں یہ شانِ خودداری ، چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے ، کوئی زیبِ گلو کر لے

پودے سے جدا ہوا تو جیسے میری گردن ہی کٹ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود سے سارے کا سارا خون نچڑ گیا ہو، جیسے دل کی دھڑکن بند ہو گئی ہو یا جیسے میری سانسیں رک گئی ہوں یا جیسے میری زندگی کا اخیر دن آ گیا ہو۔ میں ابھی اپنے آپ کو نزع کے عالم میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے کان میں ایک اور نویدِ زیست سنائی دی۔ اُس لڑکی کی ایک سہیلی مجھے اس کے جُوڑے میں سجا دیکھ کر کہہ رہی تھی: ''یہ پھول تو تمھارے جُوڑے میں پودے سے بھی زیادہ تازہ اور شگفتہ محسوس ہو رہا ہے۔''

لڑکی کی سہیلی کے روح افزا اور جاں بخش الفاظ میرے کان میں کیا پڑے، میں تو پھر سے جی اٹھا۔ وہی گھمنڈ، وہی فخر و ناز میرے دل و دماغ میں دوبارہ سرایت کر گیا۔ لیکن دنیا فانی ہے، ہر ایک نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ میں اپنے کِبر و غرور اور نادانی میں اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس لڑکی کا ظالم ہاتھ ایک مرتبہ پھر میری طرف بڑھا اور اس نے جھٹ سے مجھے اپنے بالوں سے کھینچا اور بڑی بے مروّتی سے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہاں شیشے میں مجھے اپنی شکل نہیں بلکہ اپنی اوقات نظر آ رہی تھی:

کچھ ایسے پھول بھی گزرے ہیں میری نظروں سے
جو کھل کے بھی نہ سمجھ پائے زندگی کیا ہے

مجھے زندگی کے عروج و زوال کی سمجھ آ گئی۔ مجھ پر ''ہر کمال را زوال'' کی حقیقت واضح ہو گئی۔ میری رنگت وہاں پڑے پڑے رات بھر میں پیلی پڑ گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ صبح ہوتے ہی کوڑے دان میں پھینک دیا جاؤں گا۔ صبح ہوئی تو وہی ظالم ہاتھ ایک مرتبہ پھر میری طرف بڑھا، لیکن میری توقع کے خلاف، کُوڑے کی ٹوکری میں پھینکنے سے بھی بڑا ظلم کرتے ہوئے اس لڑکی نے مجھے ایک موٹی سی کتاب میں رکھ لیا اور میری بچی کھچی سانسیں بھی مجھ سے چھین لیں۔ کالج جاتے ہی اس کے دل میں جانے کیا سوجھی، مجھے کتاب سے نکالا اور باریک سوئی میرے سینے سے آر پار کرتے ہوئے عبرت کے طور مجھے نوٹس بورڈ پر چپکا دیا۔ میں اس وقت نوٹس بورڈ ہی پر چسپاں ہوں اور اپنی لہلہاتی زندگی یاد کر کے خون کے آنسو رو رہا ہوں۔

❁

❷ ایک قلم کی آپ بیتی

ایک قلم اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے عَرَبی میں قلَم، فارسی میں خامہ یا کلک اور انگریزی میں Pen کہتے ہیں۔ میری بہت سی صورتیں ہیں۔ پرانے دور میں مجھے پرندے کے پر سے بنایا جاتا تھا، خاص طور پر بادشاہ، وزیر اور نواب مور کے پر کی تراش خراش کر کے اسے بطور قلم استعمال کرتے اور پروانے جاری کرتے تھے۔ عرصۂ دراز تک مختلف اقسام کی لکڑی سے مجھے تخلیق کیا گیا۔ پھر زمانے نے کروٹ اور سائنسی ترقی نے میری شکل بدلی اور مجھے لوہے، ربڑ اور پلاسٹک وغیرہ سے تخلیق کیا جانے لگا۔ ہولڈر، پینسل، بال پوائنٹ اور پوائنٹر وغیرہ میری ہی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ میری اشکال میں وسعت کی طرح میرے مفاہیم بھی متنوّع ہیں۔ عربی زبان میں قلم کے لغوی معنی کاٹنے یا تراشنے کے ہیں۔ غیر مادی مفہوم میں مجھے اُس قابلِ فہم تجزیاتی صلاحیت کا نام دیا جاتا ہے جس سے انسان زندگی کے حسّیاتی اور غیر حسّیاتی مثبت یا منفی پہلوؤں سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ مادی لحاظ سے بھی میرے مفاہیم مختلف النوع ہیں جو لسانی، فنی، اور تکنیکی حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ لسانی تناظر میں جانچیے تو میں وہ ہوں جس سے کسی بھی زبان کے حروف، الفاظ اور جملے لکھے جاتے ہیں۔ فنی لحاظ سے کاتب یا مصوّر کا وہ آلہ ہوں جس سے وہ اپنے شاہ کار تخلیق کرتا ہے اور تکنیکی لحاظ سے وہ کی بورڈ (Key Board) ہوں جو ٹائپ رائیٹر، کمپیوٹر یا موبائل فون وغیرہ پر نصب ہوتا ہے، مختصر یہ ہے کہ میرے

معنی ومفہوم کچھ بھی ہوں، میری ضرورت واہمیت مسلّم ہے۔ میں سقراط کے ہاتھ میں سچائی کا اعلان ہوں، افلاطون کے ہاتھ میں مثالیت کا نظریۂ حیات ہوں، ارسطو کے ہاتھ میں وجودیت کے مظاہر پیش کرتا ہوں۔ کتنا خوش قسمت ہوں کہ قرآن پاک اور احادیث میں مرقوم ہوں۔ فنکار کے ہاتھ میں ہوں تو کہیں تصویریں بناتا ہوں، کہیں کیلی گرافی کے جوہر دکھاتا ہوں، کہیں کتابت اور کہیں رسم الخط کی مثالیں قائم کرتا ہوں۔ سائنس دان کے ہاتھ میں ہوں تو کتنے فارمولے، نظریے اور تجربے میرے مرہونِ احسان ہیں۔ ادیب کے ہاتھ میں ہوں تو داستان، ناول، افسانہ، مضمون اور انشائیہ تخلیق کرتا ہوں اور شاعر کے ہاتھ میں ہوں تو رباعی، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، غزل اور سب سے بڑھ کر حمد ونعت رقم کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

آپ کو ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ میرا اصل منصب یہ ہے کہ میں پڑھنے اور پڑھانے کے عمل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہوں۔ کمرۂ جماعت میں تختۂ سیاہ ہوتو معلمین عام طور پر سفید چاک کی صورت میں مجھے استعمال کرتے ہیں اور اگر تختۂ سفید (White Board) ہوتو سیاہ یا رنگین مارکر سے علم کے رنگ بکھیرتے ہیں۔ میں طلبہ کے ہر جگہ کام آتا ہوں۔ کمرۂ جماعت میں ان کی نوٹ بکس اور امتحان گاہ میں ان کی جوابی کاپیاں میری مرہونِ منّت ہیں۔ وہ جیسے چاہیں صفحۂ قرطاس پر علم کے موتی بکھیریں، میں بہر حال ہمہ وقت ان کی معاونت میں پیش پیش رہتا ہوں۔

حضرات! کسی بھی معاشرے میں عدل وانصاف کی اقدار ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں جس وقت منصف کے ہاتھ میں ہوتا ہوں تو دراصل انسانیت کے تحفّظ پر مامور ہوتا ہوں۔ انصاف پر مبنی فیصلے قوموں کی تقدیر لکھتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے کیے گئے فیصلے سنہری الفاظ میں رقم ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت کسے یاد نہیں کہ انصاف کا علم بلند رکھنے کے لیے خود بھی ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو گئے۔ محترمین! خدانخواستہ اگر ناانصافی پر مبنی فیصلہ رقم ہو رہا ہو تو میں کانپ کانپ جاتا ہوں، میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور میں سر جھکائے اللہ تعالیٰ سے ایسے غلط منصف کے لیے ہدایت اور قوم کے لیے رحم کی دعا مانگتا ہوں۔

رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے: ''روزِ قیامت علما کے قلم کی سیاہی اور شہدا کے خون کو تولا جائے گا تو علما کے قلم کی سیاہی شہدا کے خون سے زیادہ وزنی ہو جائے گی۔'' (بحوالہ کنز العمال ۱۰/۱۴۱) آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کا یہ ارشاد ایسا کھرا اور شفّاف آئینہ ہے کہ جس میں ہر دور کی تاریخ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ تلوار اور قلم ہر دور میں موجود رہے ہیں اور عوام وخواص کو ہمیشہ اس کی ضرورت رہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ تلوار وقتی ضرورت کو پورا کرتی ہے جب کہ قلم دائمی ضروریات کی تسکین کا باعث ہے۔ سوائے اللہ تعالیٰ کی راہ میں تلوار اٹھانے والے کے، کون ایسا شخص ہے جس کا نام زندہ رہا، جب کہ اہلِ قلم کبھی فنا نہیں ہوتے:

تاریخ کے اوراق الٹ کر ذرا دیکھو ہر دور میں تلوار ہی ہاری ہے قلم سے

میں اپنی بحث ان الفاظ میں سمیٹتا ہوں کہ میں وہ آلہ ہوں جس سے تعمیر بھی کی جا سکتی ہے اور تخریب بھی۔ اب یہ قلم کار پر منحصر ہے کہ وہ کس ظرف کا مظاہرہ کرتا ہے:

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکسر ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

۳ ایک درخت کی آپ بیتی

میں آم کا ایک درخت ہوں۔ کئی سال پہلے میرے مالک نے مجھے ایک گملے سے نکال کر اپنے باغیچے میں لگا دیا۔ باغیچے کا ماحول میرے لیے یک سر اجنبی تھا۔ میری اس اجنبیت کو کم کرنے کے لیے باغیچے کا مالی روزانہ میری ننھی سرخ کونپلوں پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتا، مجھے پیار کرتا اور خصوصی توجہ دیتا۔ وقت گزرتا گیا، مجھے اس ماحول سے شناسائی ہونے لگی۔ زرخیز مٹی میں نمکیات اور پانی کی فراہمی میری خوراک کا لازمی جزو تھے۔ مجھے میری خوراک اور موسموں کے تغیّر و تبدّل کی سختی سے بچانے کے مناسب انتظامات باغیچے کے مالی کی اوّلین ترجیحات میں شامل تھے۔ سردیوں سے مجھے سخت نفرت تھی کیونکہ موسم سرما کے زمانے کا گرد و غبار میری ننھی کونپلوں پر جم جاتا تھا اور رات کو پڑنے والا کہرا میرے روشنی جذب کرنے والے مسامات کو متاثر کرتا تھا۔ موسم سرما کی شدت مجھے اکثر بیمار کر دیتی تھی۔ مالی مجھے سردی سے بچانے کی بھرپور کوشش کرتا لیکن موسم کی شدت کے آگے وہ بھی بے بس ہو جاتا۔

فروری کے مہینے میں موسمِ سرما کی شدت کم ہوتی تو مجھے بھی سکھ کا سانس آتا۔ بارانِ رحمت میری ننّھی کونپلوں کے چہرے کو دھو ڈالتا اور پورا جسم کھل اٹھتا۔ میرے رخ پر ہریالی مسکرانے لگتی، جسے دیکھ کر مالی کا چہرہ بھی کھل اٹھتا۔ موسمِ گرما میرا پسندیدہ موسم ہے۔ جون اور جولائی کی گرمی برداشت کرنا اگرچہ مشکل کام ہوتا ہے لیکن میں جوانی کے ایام میں قدم رکھ چکا تھا، اس لیے گرمی کی شدّت مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ مارچ اور اپریل میں پھوٹنے والی میری ننھی کونپلیں مئی میں مکمل پتّوں کی صورت میں ڈھل جاتی تھیں۔ یہی پتّے ماحول میں آلودگی کم کرنے اور آکسیجن کی فراہمی میں میرے مددگار بن جاتے اور میری قوتِ برداشت بڑھ جاتی۔ موسمِ برسات کی آمد سے پہلے میری ٹہنیوں پر بُور آنے اور ننھے پھل لگنے کا مرحلہ مکمل ہو جاتا۔ اپریل میں میری شاخوں پر آنے والا بُور ننھے آم کے پھل کی شکل اختیار کر لیتا تو چھوٹے چھوٹے آموں کو بچے بڑی حسرت سے دیکھتے۔ آخر کار جولائی اگست میں ساون کی جھڑی لگ جاتی اور میرے پھل پکنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ لوگ میرے پھل مزے لے لے کر کھاتے اور مجھے پھلوں کے بادشاہ کے لفظ سے نوازتے، میرے سائے میں بیٹھ کر پھلوں کا مزہ لیتے اور اکثر میرے کانوں میں یہ آواز بھی پڑتی کہ مشہورِ زمانہ شاعروں مرزا غالب اور علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی بے حد مرغوب غذا رہا ہوں۔

ہر سال وقت اپنے آپ کو دہراتا چلا جاتا اور میں گزشتہ سالوں کے مقابلے میں ہر اگلے سال اپنی زیادہ توانائی صرف کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ مجھ پر اور زیادہ پھل لگیں اور میں خدمتِ خلق کا پہلے سے بھی بہتر فریضہ انجام دیتا رہوں۔ تیس چالیس سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ اب باغیچے میں میرے بعد لگائے گئے پودے جو میری آنکھوں کے سامنے نشوونما پا کر پلے بڑھے تھے، ان پر زیادہ پھل پھول لگنے شروع ہو گئے۔ میرا مالی اب ان کی دیکھ بھال میں زیادہ مصروف رہتا۔

مجھ پر اب کم پھل لگتے ہیں۔ شاید اب میں بڑھاپے کی طرف گامزن ہونے لگا ہوں۔ مجھ پر بور آنا بھی بند ہو گیا ہے۔ اب میری

شاخوں میں کونپلیں پھوٹنے کی صلاحیت بھی کم ہوگئی ہے۔ موسم کی سختیاں برداشت سے باہر ہیں۔ مالی کی عدم دلچسپی کی وجہ سے میرے جسم کے کچھ حصّے خشک ہونے لگے ہیں۔ وہی لوگ جو کل تک میرے سائے میں میرے پھلوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے دکھائی دیتے تھے، اب میرے پاس بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ناقدری کا یہ عالم ہے کہ کچھ دنوں سے مجھے لوگوں کے ہاتھوں فروخت کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے بِک چکنے کے بعد میرے خریدار انتہائی بے دردی سے میری جڑوں کو کاٹ کر مجھے فنا کر دیں گے۔ میرے جسم کے کچھ حصوں کو کاٹ کر ایندھن کی نذر کیا جائے گا اور کچھ حصوں کو چیر پھاڑ کر فرنیچر کے کام میں لایا جائے گا... مگر مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ سوکھنے اور کٹ جانے کے بعد بھی میں خدمتِ خلق کا فریضہ انجام دیتا رہوں گا، بقول شاعر:

مجھے گلہ نہیں ناقدریِ زمانہ کا
میں ابتدا سے نگاہِ گہرشناس میں تھا

❁

۳ اُردو زبان کی آپ بیتی

میں اردو زبان ہوں اور مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے کہ میں اس وقت اسلامی جمہوریہ پاکستان کی قومی زبان ہوں۔ میرا خمیر برِصغیر کی سرزمین سے صدیوں پہلے تیار ہوا۔ ابتدا میں مجھے بے شمار ناموں سے پکارا گیا۔ گیارھویں سے چودھویں صدی عیسوی تک مجھے ہندی اور ہندوی کہا گیا۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں مجھے دہلوی کے نام سے پکارا گیا۔ اس کے بعد مجھے گوجری کہا گیا۔ کچھ شعرا نے مجھے دکنی کہا اور کچھ ماہرین نے مجھے ریختہ کا نام دیا۔ انگریزوں نے مجھے ہندوستانی کہہ کر پکارا لیکن بحیثیتِ زبان میری شناخت ۱۷۸۰ء کے لگ بھگ ہوئی اور مجھے بطور زبان اُردو کہہ کر پکارا گیا۔

میں نے ارتقا کا ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ میں نے اپنی شناخت برِصغیر میں اس وقت قائم کی جب آریائی زبانوں کا شہرہ تھا تو دوسری طرف سندھی، پنجابی اور دیگر مقامی زبانوں کا راج تھا۔ یہاں دینِ اسلام کی کرنیں پھوٹیں تو عربی زبان کا اثر بھی مجھ پر پڑا، فارسی بولنے والے حکمران آئے تو انھوں نے فارسی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت دی۔ انگریز حکمران آئے تو ان کی زبان بھی مجھ پر اثر انداز ہوئی۔ ان سب حقائق کے باوجود خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے اپنا تشخّص برقرار رکھا اور اپنی حیثیت منوائی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر خسرو کی تحریروں میں میری موجودگی نمایاں رہی۔ ملا وجہی نے اُردو زبان کی ابتدائی شکل میں ''سب رس'' لکھی۔ حیدرآباد دکن کے بادشاہوں اور شعرا نے اُردو زبان میں شاعری کی۔ یوں محمد قلی قطب شاہ اردو زبان کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر بنا۔ ایہام گوئی کی تحریک سے وابستہ بے شمار شعرا نے اس وقت اُردو زبان کو اپنایا کہ جب سرکار کے ہاں فارسی کا طوطی بولتا تھا۔ پھر زمانے نے میری صورت میں ولی دکنی کی جمال دوستی کو دیکھا۔ میر و سودا کے اُردو شاعری کے عہدِ زرّیں کو دیکھا۔ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ سے متعلق شعرا نے اُردو زبان میں اپنے جوہر دکھائے۔ مرزا غالب اور مومن خان مومن کے دور میں اُردو کے عروج کو کون فراموش کر سکتا ہے۔ استاد داغ اور لسان العصر

اکبرالہ آبادی کی اُردو شاعری کے ساتھ ساتھ مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی اُردو نعت گوئی جس نے انھیں حسّان الہند کے نام سے مشہور کیا، میری معراج نہیں تھی تو اور کیا تھا، پھر جس انداز سے علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے بامِ عروج تک پہنچایا، تاریخ میں ایسی مثال کم ہی ملے گی:

اُردو لسانیات کی دنیا میں فرد ہے
اُردو ولیؔ ہے ، میرؔ ہے ، سوداؔ ہے ، دردؔ ہے

سامعین! میں ہی وہ دل نشین پیکر ہوں کہ جسے بنیاد بنا کر سرسید احمد خاں نے سب سے پہلے دوقومی نظریے کے نقوش ثبت کیے۔ علی گڑھ کی علمی ادبی تحریک سے لے کر ترقی پسند تحریک کے شعری اور نثری ادب تک جو خدمات میں نے انجام دی ہیں، ان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ میں تو وہ ہوں کہ جس نے انگریزوں کو ہندوستان میں مجبور کر دیا تھا کہ وہ انگریزی چھوڑ کر ہندوستانیوں سے گفت وشنید کے لیے اُردو زبان سیکھیں۔ اسی لیے انگریزوں نے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی اور اور میر امّن دہلوی، شیر علی افسوس، بہادر علی حسینی، حیدر بخش حیدری اور کاظم علی جوان جیسے ادیبوں نے اُردو کی بہترین تخلیقات پیش کیں۔ تحریکِ پاکستان کے بڑے بڑے قائدین ہی کو دیکھ لیجیے۔ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ سمیت تقریباً تمام قائدین نے مجھے وسیلۂ اظہار بناتے ہوئے عوام النّاس تک تحریکِ پاکستان کا پیغام پہنچایا، اسے کامیاب بنایا اور نتیجے میں ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔

دین کے مبلّغ ہوں، علما ہوں، معلّمین ہوں، مفکّرین ہوں، ادیب ہوں، شاعر ہوں، سیاستدان ہوں یا ماہرینِ معیشت ہوں غرض زندگی کے ہر شعبے سے وابستہ افراد کے باہمی رابطے کی بنیاد میں اردو ہی ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ پاکستان کے تمام صوبوں میں مجھے قبولِ عام کا درجہ حاصل ہے۔ سندھی، پنجابی، بلوچی اور پشتو سمیت متعدد علاقائی بولیاں بولنے والوں کے درمیان میرا تشخّص برقرار ہے اور میں پاکستان کی قومی یک جہتی کی بنیاد کا ایک اہم ستون ہوں اور احسن طریقے سے اپنا یہ فریضہ انجام دے رہی ہوں۔ سائنس اور کمپیوٹر کے اس دور میں بھی سنجیدہ شعری اور نثری ادب مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے اور میں اس ادب کو زندگی فراہم کر رہی ہوں۔

اگرچہ انگریزی زبان کے پرستاروں نے میری وقعت کم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن میں عوامی حلقوں میں بہت مقبول ہوں۔ پاکستان کے طول وعرض میں اجنبیت دور کرنے اور لوگوں کو محبت وموافقت کے رشتے میں پرونے کے لیے میں ہی آگے بڑھتی ہوں۔ میں علاقائی اور مقامی زبانوں کے علاوہ بین الاقوامی زبان انگریزی کی موجودگی میں اپنا تہذیبی نشان ہمیشہ قائم رکھوں گی۔ زمانۂ حال کے ایک معلّم ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے میرے بارے میں کیا خوب کہا ہے:

کہیں ریشم ، کہیں اطلس ، کہیں خوشبو رکھ دوں
یہ تمنّا ہے تری یاد کو ہر سُو رکھ دوں
یہ تبسّم ، یہ تکلّم ، یہ نفاست ، یہ ادا
جی میں آتا ہے ، ترا نام میں اردو رکھ دوں

۵ سو روپے کے نوٹ کی آپ بیتی

جناب! آپ مجھے میری اِس حالت میں دیکھ کر پریشان نہ ہوں۔ میں کل تھا، میں آج ہوں اور میں آنے والے کل میں بھی رہوں گا۔ میری اہمیت کبھی ختم نہ ہونے والی ہے۔ رہی یہ بات کہ میری شکل وصورت کیسے بدل گئی، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ میرے پاس اپنی تخلیق کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ پہلے پہل میرا وجود ایک قدآور تنومند درخت کی شکل میں تھا۔ میں ایک جنگل میں پرسکون زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک دن ایک کاغذ بنانے والے کارخانے کے مالک نے مجھے خریدا۔ میرے حصّے بخرے کیے، طرح طرح کی مشینوں کے جبڑوں سے گزارا، میرے وجودِ اصل کو باریک سے باریک تر کیا اور مختلف مایہ جات استعمال کرتے ہوئے ایک کاغذ کی شکل میں ڈھال دیا۔ یہ مراحل بہت کٹھن اور پیچیدہ تھے جنھیں میرے وجود نے خندہ پیشانی اور تحمّل وبردباری سے برداشت کیا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ کچھ پانے کے لیے بقول شاعر بہت کچھ کھونا بھی پڑتا ہے، روشنی کے لیے موم بتی کی صورت آگ میں جلنا پڑتا ہے اور کچھ بننے کے لیے پیوندِ خاک ہونا پڑتا ہے:

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

میں بڑے کاغذ کی صورت میں ڈھل چکا تھا لیکن میری ٹوٹ پھوٹ اور تراش خراش کا عمل ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ مجھے ایک بار پھر مختلف مشینوں سے گزارا گیا جس سے میرے وجود پر طرح طرح کے نقوش واضح ہوتے چلے گئے۔ اس کے بعد مجھے ایک اور مشین سے گزارا گیا جس سے میرا وجود کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ وہ ٹکڑے دراصل سو سو کے کڑکتے نوٹ تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کوئی کارآمد شے بن چکا ہوں۔ مجھے بڑی عزّت وتوقیر کے ساتھ ایک بنڈل کی شکل میں باندھا گیا، پھر مجھے احتیاط کے ساتھ اٹھا کر ٹرنک میں رکھ کر شہر کے مرکزی بینک میں پہنچایا گیا۔ یہاں مجھے ایک لاکر میں رکھ دیا گیا۔ میں سمجھا کہ میرا سفر شاید یہیں ختم ہو گیا ہے لیکن یہاں سے تو میرے حقیقی سفر کا آغاز ہونے والا تھا۔ بینک میں موجود میرے ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ یہ جگہ تو عارضی ہے یہاں سے ہمیں اگلے سفر پر روانہ ہونا ہے:

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ایک دن بینک کے منیجر نے مجھے الماری سے نکالا اور ایک بنڈل کی صورت میں ایک دکان دار کو تھما دیا۔ وہ مجھے لے کر اپنی دکان پر آیا اور گلّے میں رکھ دیا۔ میں انتظار میں تھا کہ دیکھیے اب میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ دکان دار کا بیٹا سکول جانے لگا تو اس کی نظر میرے رنگ روپ پر پڑی۔ وہ للچائی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ دکان دار معاملہ کو سمجھ گیا اور اس نے گلّے میں ہاتھ ڈالا اور بیٹے کا منھ چومتے ہوئے مجھے محبت سے اُس کے سپرد کر دیا۔ وہ مجھے پکڑ کر یوں خوش ہوا جیسے اسے ایک ہزار کا نوٹ مل گیا ہو۔ تفریح کے وقت اس بچے نے

دوسموسوں کے عوض مجھے کیفے ٹیریا کے مالک کے سپرد کر دیا، وہاں سے میں ٹرک ڈرائیور کے ہاتھ، پھر پھل فروش کے ہاتھ۔ ایک عرصہ تک جب میں کسی کے ہاتھ آجاتا تو وہ خوشی محسوس کرتا۔ کوئی مجھے اپنے سینے کے ساتھ جیب کی صورت میں لگائے رکھتا، کوئی پرس میں رکھ لیتا اور کوئی ہاتھ ہی میں لپیٹ لیتا۔ میں ایک ہار فروش کے ہاتھ لگا تو اس نے مجھے نوٹوں کے ایک ہار میں پرو دیا جو ایک دُلھا کے زیبِ گلو ہوا۔ مجھے بینڈ باجے کے شور میں لوٹا اور لٹایا بھی گیا۔ یوں میں نگری نگری پھرتا رہا یعنی:

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

اب میری ناقدری کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ میں ایک بخیل اور کنجوس شخص کے ہاتھ لگ گیا۔ اس کی بند مٹھی میں میری سانس تو جیسے بند ہو رہی تھی لیکن میں بے بس تھا۔ اس نے مجھے ایک گندی سی تھیلی میں رکھ دیا۔ میں ابھی پہلی تلخ واردات سے سنبھل نہ پایا تھا کہ میں اس شخص کے بیٹے اور بیٹی کی جھپٹ میں آ گیا۔ اُن کی آپس کی لڑائی اور چھینا جھپٹی میں میرے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس ظالم شخص نے مجھے اپنے بچوں سے لے لیا اور جوڑنے کی کوشش کرنے لگا جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اگلے روز وہ مجھے واپس بینک میں لے آیا جہاں اب میں پرانے بوسیدہ نوٹوں کے ساتھ پڑا ہوں اور ماضی کی تلخ یادوں کو یاد کرتا ہوں اور آہیں بھرتا ہوں:

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب!
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

❁

۶ پرانی کرسی کی آپ بیتی

میں ایک ٹوٹی پھوٹی اور شکستہ سی کرسی ہوں۔ آپ میری اس خستہ حالی کو دیکھ کر پریشان مت ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نہایت دل کش ہوا کرتی تھی۔ مجھے دیکھ کر لوگ رشک کرتے تھے۔ میں نے ایک قابلِ قدر کرسی سے خستہ حالی کا سفر کیسے طے کیا، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ کرسی کی صورت میں ڈھلنے سے پہلے میرا وجود شیشم کے ایک قدآور درخت کا حصہ تھا یا یوں کہیے کہ میں ایک درخت ہی تھا۔

جب میں ایک درخت تھا تو بہار کی رنگینی اور پرندوں کا چہچہانا میری خوشی کی وجہ بنتا تھا۔ ایک دن ایک لکڑہارا جنگل میں آیا۔ اس نے مجھے ایک آرے سے چیرنا شروع کر دیا۔ مجھے بہت تکلیف محسوس ہو رہی تھی لیکن میں بے بس تھا۔ جیسے جیسے آرے کے تیز دندانے مجھے چیرتے جا رہے تھے میری تکلیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آخرِ کار اس نے مجھے کاٹ کر ایک ٹرک پر لاد دیا۔ مجھے ایک کارخانے میں لایا گیا جہاں سے ایک بڑھئی مجھے خرید کر اپنے ساتھ لے گیا۔

میری اذیّت اور تکلیف کا یہ سلسلہ جوں کا توں قائم رہا۔ مجھے پہلے لگا تھا کہ شاید اصل اذیت وہ تھی جس سے مجھے پہلے گزرنا پڑا تھا مگر تکلیف دہ مرحلہ دراصل اب شروع ہوا تھا۔ اس بڑھئی نے مجھے مزید چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں کاٹنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد انھیں نہایت

مہارت سے کیل کی مدد سے جوڑنا شروع کیا۔ ہتھوڑے کے ہر وار سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرے وجود کو پرزے پرزے کر دیا جائے گا۔ ہتھوڑے کے وار تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ جُوں جُوں وار تیز ہو رہے تھے، تُوں تُوں میری اذیّت مزید بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ کچھ دیر میں یہ وار رک گئے، میری تکلیف بھی کم ہو گئی اور جب میں نے اپنی نئی شکل دیکھی تو میں اپنی تکلیف بالکل ہی بھول گئی۔ اب میں ایک خوب صورت کرسی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ مجھے اپنی خوب صورتی پر ناز ہونے لگا۔ اس خوب صورتی میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب اس نے مجھے جاذبِ نظر رنگ میں رنگ دیا۔ اب میری شکل وصورت سب سے جدا اور منفرد تھی۔ مجھے خود پر فخر ہونے لگا۔ یہاں سے مجھے ایک دکان دار خرید کر اپنے ساتھ لے گیا۔ کچھ وقت تک تو میں اس کی دکان میں بڑی شان وشوکت سے براجمان رہی۔ دکان دار مجھے جلد از جلد فروخت کرنا چاہتا تھا لیکن قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے لوگ آتے، مجھے دیکھتے اور خریدے بغیر واپس چلے جاتے۔ آخر کار گاؤں کے چودھری صاحب نے مجھے خرید لیا۔ وہ مجھے اپنے گاؤں کی حویلی میں لے گئے۔ وہاں مہمانوں کے لیے اور بھی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں چوں کہ نئی تھی، اس لیے ان سب کے بیچ مجھے جگہ مل گئی۔ میں حویلی کی سجاوٹ میں اضافے کا سبب بن گئی۔ یہاں میں کافی عرصے تک ہنسی خوشی کی زندگی گزارتی رہی۔ ایک دن چودھری صاحب کے دور دراز سے کچھ خاص مہمان آئے۔ ان کے ساتھ کچھ بچے بھی تھے۔ ان بچوں نے مجھ پر اچھل کود شروع کر دی۔ اسی اثنا میں میری ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ یہاں سے میری بدقسمتی کا آغاز ہوا۔ مجھے ایک کباڑیے کو دے دیا گیا۔ اس نے میری ٹانگ کی مرمت کی اور مجھے سستے داموں ایک کریانے والے کے ہاتھ بیچ دیا۔ مجھے ایک دکان میں رکھ دیا گیا۔ مجھے سارا دن آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا رہتا۔ میں یہاں مطمئن نہ تھی کیوں کہ دکان دار کا وزن بہت زیادہ تھا جسے برداشت کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔

آخر ایک روز میں اس کے وزن کو برداشت نہ کر سکی اور میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ دوسری ٹانگ بھی کھٹاک سے ٹوٹ گئی۔ مجھے اب دکان کی چھت پر پھینک دیا گیا ہے۔ یہاں مجھے آندھی، بارش اور نت نئے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ میں اب اپنی زندگی کے آخری سانس گن رہی ہوں اور زندگی کے خوش گوار دنوں کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ منھ سے نکلی ہوئی بات، دریا کا بہتا ہوا پانی اور گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتے، اس کہاوت کا اطلاق مجھ پر بھی ہوتا ہے۔

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں　　یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
رودادِ سفر نہ چھیڑ ناصرؔ　　پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

❁

❹ ایک کتاب کی آپ بیتی

میں بارھویں جماعت کی اُردو کی کتاب ہوں۔ میری حالت دیکھ کر یقیناً آپ مجھے پہچان نہیں سکے ہوں گے۔ اس ابتر حالت تک پہنچنے کا سبب یہ ہے کہ میں طویل عرصے تک زمانے کی دست بُرد کا شکار رہی ہوں۔ میں نے بہت اذیّت ناک سفر طے کیا ہے۔ میری

صورت شروع دن سے ایسی نہ تھی۔ میری تخلیق کے محرّکات نہایت شان دار تھے۔ ہوا یہ کہ حکومت نے قومی امنگوں کے مطابق نیا نصاب متعارف کرایا۔ اس نصاب کے مطابق سالِ دوم کے لیے اردو زبان وادب کے جو اہداف مقرّر ہوئے، ان کے حصول کے لیے ملک بھر کے بہترین مصنفین، مؤلفین اور مدیران کا انتخاب کیا گیا۔ ان سب نے مل کر مجھے تخلیق کیا۔ ہر صائب الرائے نے مجھے سراہا۔ پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ نے اپنی نگرانی میں میری اشاعت کی اور میں مارکیٹ میں دستیاب ہوگئی۔ مجھے ایک ذہین طالب علم نے دکان دار سے خریدا اور اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اس نے پہلے میرا تعارف اپنے بڑے بھائی اور بہن سے کرایا اور پھر میز پر رکھ دیا۔

وہ مجھے بہت سنبھال کر رکھتا تھا کیوں کہ میں اس کی پسندیدہ کتاب تھی۔ وہ اکثر میری ظاہری اور اندرونی حالت دیکھتا، اپنی پسند کی مزے مزے کی کہانیاں پڑھتا، شعر گنگناتا اور مجھے سنبھال کر اپنے بیگ میں رکھ لیتا۔ اگرچہ اس کا بیگ تاریک تھا جہاں میرا سانس رکتا تھا، اس کے باوجود مجھے اس کے ساتھ رہنا اچھا لگتا کیوں کہ وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ وقت گزرتا گیا، کب ایک سال کا عرصہ گزرا، پتا ہی نہ چلا۔ وہ امتحان پاس کر کے اگلی جماعت میں ترقی پا گیا۔ اس نے مجھے آدھی قیمت پر دکان دار کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ یہیں سے میری بدقسمتی کا آغاز ہُوا۔ مجھے ایک اور طالب علم نے خریدا اور اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ میری بے قدری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس دفعہ میں ایک نالائق طالب علم کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ وہ نہ تو مجھے گھر میں سنبھال کے رکھتا اور نہ ہی بستے میں۔ پڑھتے وقت وہ مجھے بے دردی سے کھولتا، بے دردی سے میرے کاغذ اُلٹتا پلٹتا، میرے کاغذوں میں شکنیں ڈال دیتا، سیاہی پھینک دیتا اور کبھی کبھی تو انتہائی بے دردی سے میرے کاغذ پھاڑ بھی دیتا۔ وہ مجھے پڑھنے کے بجائے صرف اپنے امتحان کی تیاری کے حوالے سے الٹ پلٹ کر ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت ظالمانہ رویہ اختیار کیے رکھا۔ میرے صفحات جو پہلے بالکل صاف ستھرے اور کورے تھے، وہ انھیں پینسل سے خراب کر دیتا، مختلف طرح کے دھبے لگا دیتا، بے دردی سے صفحات کو پھاڑتا اور میرے دامن میں چھوٹے کاغذ کے پرزے نشانی کے لیے رکھ دیتا جس سے میری اندرونی اور بیرونی حالت روز بہ روز بگڑنے لگی۔ مجھے اس وقت بہت تکلیف ہوتی جب میں دیکھتی کہ دوسرے لائق طلبہ میری طرح کی کتابوں کی بہت قدر کرتے اور انھیں غور سے پڑھتے اور سنبھال کر رکھتے تھے۔

مجھے اپنی بے قدری اور بے وقعتی کا بہت احساس ہے۔ میں تمام طلبہ سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ کتابوں کی قدر کیا کریں۔ انھیں محنت اور توجہ سے پڑھیں اور ان میں دیے گئے مقاصد کے حصول کی ہر ممکن کوشش کریں۔ طلبہ کو چاہیے کہ کتابیں پڑھ کر کامیاب انسان بنیں اور کتابوں کو اپنا بہترین دوست سمجھیں۔

ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میری خوب صورتی ماند پڑ چکی تھی۔ مجھے اپنی حالتِ زار دیکھ کر تکلیف ہوتی لیکن میں بے بس تھی۔ وہ پڑھنے کے بعد مجھے لا پروائی سے پھینک دیتا۔ میری جلد پھٹ چکی تھی۔ ایک دن اس کی اپنے کسی ساتھی سے لڑائی ہوگئی۔ وہ ایک

دوسرے سے کتاب چھین رہے تھے۔اس کھینچا تانی میں میرے کچھ صفحات پھٹ گئے۔اب میری حالت انتہائی خستہ ہوگئی۔اس نے مجھے ایک ردی والے کو بیچ دیا۔ مجھے ایک بورے میں ڈالا گیا۔اس بورے میں میرے جیسی اور بھی مجبور ومحبوس کتابیں، اپنی بے بسی اور بے قدری کا رونا رو رہی تھیں۔وہ بورا ایک کباڑ خانے لایا گیا۔وہاں کتابوں کی چھانٹی کی گئی۔میں کباڑیے کے ہاتھ لگی تو اس نے مجھے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔کافی دنوں تک میں ردی کی ٹوکری میں پڑی اپنی قسمت کو کوستی رہی۔ایک دن ایک سموسے اور پکوڑے بیچنے والا آیا اور اس نے کباڑیے سے مجھے خرید لیا۔میری بے قدری اور بدقسمتی دیکھیے، میرا ایک ایک صفحہ الگ کیا جا رہا ہے اور اس پر پکوڑے اور سموسے رکھ کر بیچے جا رہے ہیں۔ مجھے اپنے برباد ہونے کا اتنا دکھ نہیں جتنا اس بات کا ہے کہ مجھ سے یہ ناروا سلوک کیوں رکھا گیا جب کہ میں علم کا ایک بہترین وسیلہ تھی۔کتابیں تو علم کے موتی ہیں، انھیں ہرگز پائمال نہیں ہونا چاہیے۔میری دعا ہے کہ کاش تمام طلبہ میں شعور بیدار ہو اور وہ سب کے سب کتاب دوست بن جائیں۔

❁

۸ ایک کوٹ کی آپ بیتی

میں نے کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا کہ میں اپنی زندگی ہی میں اپنی ایسی ابتر حالت بھی دیکھوں گا۔مجھ پر ''ہر کمال را زوال'' والی ضرب المثل صادق آتی ہے۔حقیقت یہی ہے کہ حالات کبھی ایک جیسے نہیں رہتے۔گردشِ ایّام اچھے وقت کو برے وقت سے بدل دیتی ہے۔آج آپ مجھے جس خستہ حالت میں دیکھ رہے ہیں، میں کبھی بھی ایسا نہیں تھا۔میری حالت تو ایسی تھی کہ تمام سجن بیلی مجھ پر رشک کرتے تھے۔میں آپ کو اپنی داستانِ حیات سناتا ہوں۔

آج سے پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ جب ایک بڑی کلاتھ مارکیٹ سے بہت مہنگا کپڑا خریدا گیا۔اس خریداری کا مقصد ایک کوٹ کی تیاری تھا۔میں وہی کوٹ ہوں، وہی ہلکے نیلے رنگ کا کوٹ۔ مجھے تیار کرتے وقت میری سلائی نہایت عمدہ اور نفیس تھی۔ مجھے بہترین درزی سے سلوایا گیا تھا۔ میں اپنے اس رنگ ڈھنگ سے بہت خوش تھا۔ مجھے ایک دُکان میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ ہر آنے والا گاہک میری طرف کھنچا چلا آتا تھا مگر میری قیمت سے ڈر جاتا تھا۔بالآخر ایک صاحبِ ثروت نے مجھے وہاں سے خرید لیا اور اپنے گھر لے گیا۔اس شخص کا بیٹا بارھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔میں دراصل اسی بیٹے کی کالج یونیفارم کے طور پر خریدا گیا تھا۔وہ طالب علم سردیوں میں مجھے ہر روز کالج پہن کر جاتا، مجھے صاف کرتا اور برش پھیرتا تھا۔میں اس کا پسندیدہ کوٹ تھا۔اس کی الماری میں مجھ جیسے اور بھی کوٹ تھے لیکن مجھے اس کے پسندیدہ ترین ہونے کا شرف حاصل تھا اور یہی بات میرے لیے باعثِ مسرّت تھی۔

وقت گزرتا گیا۔وہ طالب علم روز بروز جوان ہو رہا تھا مگر میں اکثر اس کے زیبِ تن رہتا تھا۔جب اس نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر لیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب اسے میری ضرورت نہیں ہوگی کیوں کہ اب اسے کالج یونیفارم کی ضرورت نہیں رہی تھی۔اس

لڑکے کا قد بھی لمبا ہو رہا تھا، اس لیے یہ بھی خطرے کی ایک گھنٹی تھی۔ مجھے آنے والے وقت سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ آخر وہی ہُوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس لڑکے نے ایک دو مرتبہ مجھے پہننے کی کوشش کی مگر اب میں اس کے کسی کام کا نہ رہا تھا۔ اب وہ میرا خیال نہیں رکھتا تھا۔ اس نے مجھے اپنی الماری سے باہر نکال دیا۔

اب میرا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ میں کبھی زمین پر پڑا ہوتا اور کبھی کرسی یا میز پر۔ بالآخر گھر کی مالکن نے مجھے ایک نوکرانی کے سپرد کر دیا۔ وہ شام کو جاتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئی۔ وہاں اس کا کوئی ایسا بیٹا تو تھا نہیں جو مجھے پہن سکتا، اس لیے ادھر ادھر گرا پڑا رہتا۔ اب مجھ پر طرح طرح کے دھبوں کے نشان پڑنے لگ گئے تھے اور میں جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ مجھے یہاں سے بھی اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا۔

میں راہ جاتے ایک نشئی کے ہاتھ لگ گیا جس نے مجھے کئی دنوں سے پہن رکھا ہے۔ اب کوئی میرا پرسانِ حال نہیں۔ میں جو کبھی ایک خوب صورت کوٹ تھا... ایک خوب صورت کوٹ میرے لیے اب بھیانک خواب بن کر رہ گیا ہے۔ مجھے اب گزرے دِنوں کی یاد ستاتی ہے لیکن اب وہ دن کہاں! اب مجھے سکون کہاں! میں تو اب کوٹ کہلانے کے بھی قابل نہیں رہا۔

❁

۹ ایک کوڑے دان کی آپ بیتی

میں ایک پارک میں کوڑے دان کے طور پہ نصب ہونے والا ڈرم ہوں۔ میرا رنگ پیلا ہے اور مجھ پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے: ''مجھے استعمال کریں۔'' لوگ مجھ میں کوڑا کرکٹ پھینکتے ہیں۔ اس طرح میں پارک کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہوں۔

جب مجھے خام مال سے ایک ڈرم کی صورت میں ڈھالا گیا تب میرے تصوّر میں بھی نہیں تھا کہ میں گندگی سمیٹنے کے لیے بنایا گیا ہوں اور میرے تصوّر میں آتا بھی کیسے! میرے جیسے سیکڑوں ہیں، جو اسی خام مال سے تیار ہوتے ہیں لیکن کوئی صاف پانی ذخیرہ کرنے کے استعمال میں آتا ہے اور کوئی پیٹرول سنبھالنے کے؛ کسی میں شیرہ جمع کیا جاتا ہے اور کسی میں دودھ۔ آخر مجھے ہی کوڑا کرکٹ کے لیے کیوں منتخب کیا گیا؟ شاید یہ میری قسمت میں لکھا ہوا تھا:

تدبیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی
بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

پارک کی انتظامیہ جب مجھے خریدنے آئی تو میں کارخانے کے مالک کے ساتھ ان کی گفت گو سن رہا تھا۔ پہلے پہل میں نے سمجھا کہ جب پارک والے مجھے خرید کر لے جائیں گے تو شاید مجھے پانی ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کریں یا شاید مجھے مصنوعی کھاد سے بھر دیا جائے یا پھر اوزار وغیرہ سنبھالنے کے کام آؤں۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ ان میں سے کوئی مقام حاصل ہو گا تو ہریالیوں میں، پھولوں میں اور خوشبوؤں میں تو جگہ پاؤں گا۔ میرے تو اس وقت پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی جب میری توقعات کے برعکس

مجھے کوڑا دان بنا دیا گیا اور میری چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے اس پر یہ جملہ لکھ دیا گیا: ''مجھے استعمال کریں۔''

لوگوں کی قسمت دیکھیے کہ وہ صفائی کو ایمان کا حصہ سمجھتے ہوئے خود کو صاف ستھرا رکھتے ہیں، اپنے اردگرد کے ماحول کو صاف ستھرا رکھتے ہیں اور صاف ستھری چیزیں استعمال کرتے ہیں۔

میری بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ دنیا بھر کا فضول کاٹھ کباڑ اور آلائشیں اپنے اندر سمیٹتا ہوں۔ یہ خدمات انجام دیتے ہوئے میں خود گندا اور میلا کچیلا ہو جاتا ہوں۔ اپنے آپ کو جتنا بھی صاف ستھرا رکھوں، گندا ہونا میرا مقدّر ہے۔

میں اسی مایوسی کے عالم میں زندگی کے دن گزار رہا تھا کہ قدرت نے میرے ذہن میں کچھ ایسی باتیں ڈال دیں اور مجھ پر کچھ ایسے حقائق منکشف کر دیے کہ میں پھر سے جی اٹھا۔ میری محرومیاں ختم ہو گئیں، میری حسرتیں دم توڑ گئیں اور میری مایوسیاں کامرانیوں کا روپ دھار گئیں۔ ہوا یہ کہ ایک کڑکتی دھوپ میں میری نظر پارک کی زمین پر پڑی۔ میں نے غور کیا تو مجھے اس میں سے سونا اگلتا نظر آیا، کونپلیں پھوٹتی نظر آئیں، سبزہ نکلتا دکھائی دیا، پھول دکھائی دیے اور پھلوں کی مہکار آئی لیکن کیا تھا کہ وہ زمین زندگی کے تمام تر خزانے لُٹانے کے باوجود نیچے بچھی ہوئی تھی، اِنسان، حیوان، چرند، پرند سب کی پامالی کا شکار تھی۔ میں نے دیکھا کہ اسی پارک کے بڑے قدآور درخت جو چھاؤں دیتے تھے، پھل، پھول دیتے تھے اور ٹھنڈی ہواؤں کے پنکھے چلاتے تھے۔ ان کو چیرا پھاڑا گیا یہاں تک کہ جلایا گیا، انھوں نے اف تک نہ کی، گلہ تو دور کی بات! پھر میرے سامنے سورج کا چہرہ آیا جو روشنی دیتا ہے، تپش دیتا ہے، حرارت پہنچاتا ہے، موسموں کو تغیّر و تبدُّل سے آشنا کرتا ہے۔ اس کی روشنی سے پھول کھلتے ہیں، پھل پکتے ہیں۔ چار دن کے لیے غائب ہو جائے تو زمین پر دس دس فٹ برف جم جائے اور زندگی کا نام و نشان مٹ جائے۔ مگر ازل سے اب تک جل رہا ہے خاموشی سے، صبر سے، بغیر کوئی گلہ کیے، بغیر کسی شکوہ اور شکایت کے۔

قدرت نے جب مجھے یہ حقائق دکھائے تو میں اپنی کم ظرفی پر شرمندہ ہوا کہ اس قدر ایثار کرنے والوں اور اتنی بڑی خدمات انجام دینے والوں کے مقابلے میں میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ قدرت نے ہر کسی کے ذمے وہی کیا ہے کہ جس کے وہ قابل ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

قِسمت کیا ہر اک کو قسّامِ ازل نے جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا غم ہم کو دیا، سب سے جو مشکل نظر آیا

اب میرا شعور بیدار ہو چکا ہے۔ مجھے اب اپنا کردار سمجھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ کوڑے دان کے طور پر ہی صحیح رہے گا۔ میں دوسروں کے کام تو آ رہا ہوں، مجھ پر لکھا ہوا: ''مجھے استعمال کرو'' میرے لیے قابلِ فخر ہے۔

آپ بیتی لکھنے کے لیے مجوزہ عنوانات

- ایک تتلی کی آپ بیتی
- قبر پر نصب کتبے کی آپ بیتی
- ایک جوہڑ کی آپ بیتی
- ایک جوتے کی آپ بیتی
- ایک فٹ بال کی آپ بیتی
- بادشاہی مسجد لاہور کی آپ بیتی
- مینارِ پاکستان کی آپ بیتی
- قربانی کے بکرے کی آپ بیتی
- چنے کی آپ بیتی